مطالعۂ قرآن کے اساسی اصول (۲)

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*
Sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی کلمات: قرآن فہمی، مطالعہ، اصول، ڈاکٹر سروش، سر سید احمد خان، دینی معرفت، بشری معرفت۔

خلاصہ

قرآن کریم ایک آسمانی کتاب ہے جس سے رہنمائی پانے کا پہلا اساسی اصول یہ ہے کہ قرآن انسانی فکر و عمل کی ہدایت کی کتاب ہے؛ لہٰذا اِس سے سائنسی علوم کے مسائل کا حل نکالنے اور بشری معارف ڈھونڈنے کی بجائے عملی میدان میں رہنمائی کے حصول کو ترجیح دی جائے۔ دوسرا یہ کہ قرآن فہمی کی کوششیں تنہا قرآن کے معصوم معلّمین کی رہنمائی میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں اور قرآن کا ہر وہ فہم اور ہر وہ تفسیر جو معصومین علیہم السلام کے فہم سے تضادّ رکھتا ہو، باطل اور تفسیر بہ رائی کا مصداق ہے۔

مطالعۂ قرآن کا تیسرا اساسی اصول یہ ہے کہ قرآن اپنے قاری تک اپنے مطالب پہنچانے اور ہدایت کے عمل میں بشری علوم اور معرفت کا محتاج نہیں ہے۔ بعض روشن فکر مصنّفین کے بر عکس، بشری علوم میں آنے والی تبدیلیوں اور سائنس کی دنیا کے جدید انکشافات سے لازمی طور پر قرآن کے قاری اور مفسّر کی قرآن فہمی میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں آتی۔ لہٰذا بشری علوم کی تازہ ترین معلومات سے آشنائی کو قرآن فہمی اور تفسیر کی شرط لازم قرار دینا، سراسر غلط ہے۔ ہاں! ایک قاری کے لیے قرآن کی زبان و ادبیات، نیز بعض قرآنی علوم اور قرآن کے مطالعہ اور تفسیر کے بنیادی اصولوں سے آشنا ہونا ضروری ہے۔

* ۔ محقق، استاذ فلسفہ اسلامی، ڈائریکٹر "نَمت"، بارہ کہو، اسلام آباد۔

گذشتہ مطالب کا خلاصہ

نور معرفت کے سابقہ شمارے میں مطالعۂ قرآن کے پہلے دو اساسی اصولوں پر تفصیلی بحث قارئین کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔اس بحث کا خلاصہ یہ تھا کہ مطالعۂ قرآن میں لغزشوں سے بچنے کے لیے جن رہنما اصولوں کی پیروی ضروری ہے ان میں سے **پہلا اساسی اصول** یہ ہے کہ قرآن کریم کو بشری ہدایت کی کتاب قرار دے کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تنہا اسی صورت میں قرآن کا مطالعہ ایک قاری کے لیے حقیقی معنوں میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ باقی رہا قرآن کریم میں کسی ایک یا کئی ایک بشری علوم کے مسائل کا حل تلاش کرنے کا سوال تو اس حوالے سے جو مطلب بیان ہوا وہ یہ تھا کہ قرآن کریم بنیادی طور پر بشری ہدایت کی کتاب ہے؛ ہاں! قرآن کریم کی آیات سے دنیاوی علوم کے مسائل کا حل ڈھونڈنا بھی ناممکن نہیں ہے۔

قرآن فہمی کا **دوسرا اساسی اصول** یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے، قرآن کے معلّمین سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے فرمودات اور آپ ﷺ کے وارثانِ علم، یعنی ائمہ اطہار علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں قرآنی آیات کے مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔اور مطالعۂ قرآن کے نتیجے میں ہر ایسا مطلب اخذ کرنے سے پرہیز کیا جائے جو ان ہستیوں کی قرآن فہمی سے متصادم ہو۔ کیونکہ قرآنی آیات سے ایسا مطلب اخذ کرنا جو ان معصوم ہستیوں کے فہم سے تضاد میں ہو، یقینا غیر معتبر اور ناقابل قبول ہے۔ ذیل میں ہم مطالعۂ قرآن کے چند دیگر اساسی اصولوں پر روشنی ڈالیں گے۔

مطالعۂ قرآن کا تیسرا اساسی اصول

قرآن، علوم کا پیشوا، نہ پیروکار

مطالعۂ قرآن کا تیسرا اساسی اصول یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے مطالب کے بیان میں ریاضیات، نجوم، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، طبیعیات، غرض کہ اکثر دنیاوی علوم سے مدد لینے سے بے نیاز ہے۔ دوسرے الفاظ

میں بشری علوم کے ساتھ تعامل میں قرآن کا مقام و مرتبہ قائد، رہنما اور مرشد کا ہے، نہ کہ پیروکار یا Consumer کا۔ مطالعہ قرآن کے اس اساسی اصول کی توضیح اور تشریح بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اِس اصول کے مخالف نظریہ کو بیان کریں تاکہ "تُعرفُ الاشیاءُ باضدادھا" (یعنی اشیاء کی شناخت ان کی اضداد کے ذریعے ہوتی ہے) کے قانون کے مطابق اِس اصول کو بہتر سمجھا جاسکے۔

قرآن کی احتیاج کا نظریہ

قرآن فہمی کے حوالے سے بعض روشن فکر افراد کا گمان یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک صامت (ساکت) متن ہے جو اپنے قاری کے شخصی علم و شعور اور فہم و فراست کے مطابق بولتا ہے۔ لہٰذا قرآن کا قاری جس قدر پڑھا لکھا (Educated) ہوگا، قرآن سے اتنی رہنمائی حاصل کر پائے گا۔ اگرچہ اس نظریہ کے قائلین نے کھلے الفاظ میں قرآن کی احتیاج کے عنوان سے یہ نظریہ پیش نہیں کیا لیکن اُن کے بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ قرآن اپنے قاری تک اپنے مطالب پہنچانے میں قاری کے علم و ہنر، اُس کی معرفت و عرفان اور اُس کی دنیاوی علوم سے آگاہی کا محتاج ہے۔

اس نظریہ کی روشنی میں جب تک قرآن کا قاری ماہرین لسانیات، اہل لغت بالخصوص عربی ادبیات کے ماہرین اور امرء القیس، ابو نواس اور فراء جیسے عرب شعراء کا کلام نہ پڑھ لے، یا نفسیات میں جیمز میکین، رائمنڈ کیٹل، ولیم جیمز اور فرائیڈ جیسے بعض ماہرین نفسیات کے نظریات نہ کنگھال لے، یا فلسفے میں کانٹ، ہیگل، نٹشے اور چامسکی کی تحریریں الٹ پلٹ نہ لے، یا سائنسی دینا کی جدید ترین کشفیات پر اُس کی نظر نہ ہو، تو وہ قرآنی آیات سے کوئی خاطر خواہ استفادہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ بعض مصنفین کے نظریات کے مطابق جس شخص کی عصری علوم پر گرفت نہ ہوگی، وہ قرآن کے مطالعہ سے کمال کا استفادہ حاصل نہ کر پائے گا۔

اس عقیدہ کے ماننے والوں کے مطابق قرآنی آیات سے بھرپور استفادہ کرنے کی پیشگی شرط یا اصطلاح میں Pre-Condition قرآن کے قاری کی ماہرین لسانیات، ماہرین نفسیات، ماہرین اقتصادیات، ماہرین فلسفہ و تاریخ، ماہرین طبیعیات اور ماہرین عمرانیات وغیرہ کے علمی آثار سے آگاہی ہے۔ یعنی اگر ایک قاری، قرآنی آیات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ مختلف علوم میں اپنی معلومات عامہ کو بڑھائے۔ اُسے جہان شناسی (Ontology) اور انسان شناسی (Anthropology) کی تازہ ترین کشفیات سے آگاہ ہونا چاہیے تاکہ وہ ان معلومات کی روشنی میں قرآنی آیات کو بہتر سمجھ سکے۔

ڈاکٹر سروش کے خیالات

جن لوگوں نے مطالعۂ قرآن کے باب میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے قرآن کریم کے بشری علوم کی طرف محتاج ہونے کا نظریہ سامنے آتا ہے اُن میں سے ایک معروف شخصیت، ایرانی ماہرِ نفسیات اور مصنف ڈاکٹر عبدالکریم سروش ہیں۔ موصوف کا دعوی یہ ہے کہ بشری معرفت اور دنیاوی علوم میں آنے والا ہر پھیلاؤ اور سکڑاؤ، دینی متون (قرآن و سنت) سے قاری کے فہم میں تبدیلی ایجاد کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب بھی طبیعی علوم میں کوئی نیا نظریہ جنم لیتا ہے، لامحالہ یہ نظریہ ایک دیندار کے دینی متون سے فہم کو بھی دگرگون کر دیتا ہے۔ موصوف اپنی کتاب " قبض و بسط تئوریک شریعت" میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"انسانی علوم کے مختلف شعبے دائمی طور پر ایک دوسرے سے لین دین [Give & Take] میں ہیں۔ اگر سائنس کی دنیا میں کوئی نیا نکتہ سامنے آ جائے تو وہ معرفت شناسی یا فلسفے کو متاثر کرتا ہے۔ (برعکس،) انسان کے فلسفی فہم میں تبدیلی، اُس کے انسان اور جہان کے بارے میں فہم کو دگرگون کر دیتی ہے۔ جب انسان اور جہان کا نیا چہرہ سامنے آتا ہے تو دینی معرفت بھی نیا معنی پا لیتی ہے۔۔۔"(1)

ڈاکٹر سروش ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"ایک دیندار کا دینی فہم، اُس کے پہلے سے موجود مستقل تصور کائنات [World View] سے کٹ کر کبھی تشکیل نہیں پاتا اور اس تصور کائنات میں تبدیلی کے بعد کوئی دینی فہم اپنی سابقہ حالت پر باقی نہیں رہ سکتا۔"(2)

موصوف کا دعوی ہے کہ:

"ہر چیز (منجملہ شریعت) کے بارے میں ہمارا فہم مسلسل بہاؤ میں ہے اور اگر بشری علوم کے موجزن سمندر کے کسی ایک گوشے میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو یہ تبدیلی اس سمندر کے دیگر گوشوں کو بھی آسودہ خاطر نہیں چھوڑے گی اور یوں معرفت کے بعض جدید موضوعات سامنے آئیں گے یا بعض کی تائید ہو گی اور بعض کا ابطال ہو گا۔ یہ نکتہ کہ ہماری تمام تر معلومات چھپے ہوئے اور نامرئی موضوعات کے ساتھ پیوند خوردہ ہیں اور اُن کے درمیان کئی منطقی، معرفت شناختی، تصوری اور تصدیقی روابط برقرار ہیں، جدید معرفت شناسی کے دقیق ترین انکشافات میں سے ہے۔"(3)

بعض دانش وروں نے ڈاکٹر سروش کی کتاب " قبض و بسط تئوریک شریعت" کے مطالب کا درج ذیل تین بنیادی اصول میں خلاصہ کیا ہے:

- شریعت کا فہم، صحیح ہو یا غلط اول سے آخر تک انسانی علوم سے استفادہ کرتا ہے، اُن سے مدد طلب کرتا ہے اور اُن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اور دینی علوم اور انسانی علوم کے درمیان ایک دائمی لین دین اور Dialogue برقرار ہے۔
- اگر انسانی علوم میں کوئی سکڑاؤ یا پھیلاؤ آئے تو ہمارا شرعی فہم بھی سکڑاؤ یا پھیلاؤ کا شکار ہو جائے گا۔
- انسانی علوم (انسان کا عالم طبیعت اور جہان کے بارے میں فہم: سائنس اور فلسفہ) میں سکڑاؤ، پھیلاؤ آتا رہتا ہے۔
- ہمارے دینی علوم انسانی علوم سے مستقل اور اُن سے غنی نہیں ہیں۔ (4)

یہاں پہلے نکتے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم سے ایک قاری اُس وقت تک کوئی فہم حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ انسانی علوم سے بہرہ مند نہ ہو۔ دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے قاری کا اِن متون سے فہم کبھی پائیدار نہیں رہ سکتا بلکہ اُس میں ایک مسلسل اتار چڑھاؤ اور تبدیلی آتی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآنی آیات سے ایک قاری غلط یا صحیح جو فہم بھی حاصل کرتا ہے، وہ انسانی علوم کا مرہون منت ہے اور قرآن بنی نوع بشر تک اپنے مطالب پہنچانے میں انسانی علوم کا محتاج ہے۔

اس نظریہ کے حامیوں نے جن جزوی مثالوں کا سہارا لے کر اپنا مدعی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ جدید علم ہیات اور نجوم (Astronomy) کی روشنی میں انسان کا شمس و قمر اور افلاک و آسمان کے بارے میں فہم سراسر تبدیل ہو چکا ہے۔ ماضی کے انسان کے لیے سورج محض ایک بہت بڑا دہکتا انگارہ تھا، جبکہ آج کے انسان کے لیے سورج کئی گیسوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ماضی میں زمین کے گھومنے کا تصور اذہان میں نہیں پایا جاتا تھا لیکن آج زمین بیک وقت اپنے گرد اور اپنے مدار میں گھومنے والا جسم ہے۔ اسی طرح ستاروں، سیاروں اور افلاک و نجوم کے بارے میں جدید تصورات نے قدیم تصورات کو باطل قرار دے دیا ہے۔ طبیعیات میں سینکڑوں تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ نیز انسان شناسی میں جدید نظریات سامنے آ رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدیم دور کے قارئین قرآن جب اُن آیات کا مطالعہ کرتے تھے جن میں شمس و قمر، دن رات، ستاروں اور اُن کے مداروں، زمین و آسمان، سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں، غرض کہ طبیعی مناظر اور انسان حقائق پر بحث ہوئی ہے، تو اِن آیات سے اُن کا دینی فہم، قدیم طبیعیات، فلکیات، علم ہیئت و نجوم اور انسان شناسی کی تعلیمات کی روشنی میں تشکیل پایا تھا۔ اور اب جبکہ ان بشری علوم کے بنیادی

تصورات بھی باطل ثابت ہو چکے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اِن باطل تصورات کی روشنی میں تشکیل پانے والا دینی فہم بھی باطل ہو چکا ہے۔

بعض روشن فکر مفسرین کا کہنا ہے کہ جب تک جدید علوم کی کشفیات کی روشنی میں یہ بات سامنے نہ آئی تھی کہ ہمارے ماحول میں کچھ ایسے موذی جراثیم پائے جاتے ہیں جو معمولی آنکھ سے نظر نہیں آتے اور یہ جراثیم ہمارے بدن پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جب ہمیں چھو لیتے ہیں تو ہمارے حواس کے نظام میں خرابیاں ایجاد کر دیتے ہیں، اُس وقت تک یہ ممکن نہ تھا کہ قرآنی آیات کے مطالعہ کے دوران وہ "شیطان" کے لفظ سے یہی جراثیم مراد لیں۔ لیکن اب جبکہ معلوم ہوا کہ ایسے جراثیموں کو بھی عربی زبان میں "شیطان" کا نام دیا جا سکتا ہے تو اب قرآنی آیات کے مطالعہ کے دوران ایک قاری "شیطان کے مس" سے جو معنی مراد لے گا وہ موذی جراثیموں سے آلودہ ہونا ہوگا۔ پس قاری کے قرآنی آیات سے اِس فہم میں تبدیلی کا سبب، انسانی علوم میں تبدیلی ہے۔

سر سید احمد خان کی تاویلات

جن لوگوں نے عملی طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ایسی روش اپنائی ہے جس سے قرآن کریم کے سائنسی علوم کی طرف محتاج ہونے کا نظریہ سامنے آتا ہے، اُن میں برصغیر پاک و ہند کی معروف شخصیت سر سید احمد خان جیسے بعض روشنفکر مسلمان مصنفین کا نام بھی بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خان کی تصنیف "تفسیر القرآن" قرآن کریم کی سائنسی انکشافات کی روشنی میں تفسیر کی عملی کاوشوں کا نمونہ ہے۔

وحی، ملائیکہ، جبرائیل اور شیطان کے وجود کے بارے میں سر سید احمد خان کے نظریات اور تاویلات قابل ذکر ہیں۔ سر سید احمد خان نے جدید سائنسز کی کشفیات کی روشنی میں اپنی تفسیر "تفسیر القرآن" میں بڑی صراحت کے ساتھ امینِ وحی حضرت جبرائیل کے مستقل وجود کا انکار کیا۔ اِس حوالے سے اُن کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا اور پیغمبر کے درمیان جبرائیل نامی کوئی قاصد نہیں ہے۔ بلکہ جبرائیل اُس ملکۂ نبوت اور انبیاء کے اندر پائی جانے والی ایک فطری قوت کا نام ہے۔ پیغمبر کا دل وہ آئینہ ہے جس میں ربانی انوار کی تجلی ہوتی ہے اور پیغمبر کا دل ہی وہ قاصد ہے جو پیغمبر کے پیغام کو خدا تک اور خدا کے پیغام کو پیغمبر تک پہنچاتا ہے۔(5)

سر سید احمد خان نے بڑی صراحت اور دیدہ دلیری سے یہ نظریہ اپنایا کہ ملائیکہ کا کوئی واقعی وجود نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ملائیکہ تو قدرت الٰہی کی لامتناہی تجلیات کا ظہور ہیں۔ ہر مخلوق میں خدا کی طرف سے رکھی گئی

پوشیدہ طاقت کا نام فرشتہ ہے۔ اور ابلیس یا شیطان بھی انہی قوتوں میں سے ایک قوت کا نام ہے۔ پہاڑوں کی صلابت، پانی کی لطافت، سبزے اور درختوں میں نشوونما کی طاقت، بجلی کا جاذبہ اور حیوانوں کی جنسی طاقت، خلاصہ یہ کہ یہ سب وہی "ملائیکہ" ہیں جن کا بیان قرآن میں آیا ہے۔ (6) خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر سروش اور سر سید احمد خان جیسے روشن فکر دانش وروں کے بیانات کی روشنی میں یہ نتائج سامنے آتے ہیں:

1. قرآن اپنی تفسیر اور اپنے مطالب کے بیان میں بشری علوم کا محتاج ہے۔
2. بشری علوم میں ہر پیشرفت اور جدید انکشاف، نہ تنہا انسان کے کائنات کے بارے میں تصور اور فلسفی فہم کو بلکہ قرآنی آیات سے اخذ شدہ مطالب کو بھی تبدیل کر دیتا ہے۔
3. لہٰذا قرآن کے قاری اور ایک مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بشری علوم اور ان میں ہونے والے جدید انکشافات سے ہر دَم آگاہ رہے تاکہ اُن کی روشنی میں قرآن کا بہتر فہم حاصل کر سکے۔

قرآن کی احتیاج کے نظریے کا تنقیدی جائزہ

اگر مطالعہ قرآن کے مذکورہ بالا نظریہ کا دقت سے جائزہ لیا جائے تو یہ نظریہ، ایک باطل نظریہ ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نظریہ قرآن کریم سے ہدایت پانے میں مانع ہے۔ کیونکہ اگر اس نظریہ کو من و عن مان لیا جائے تو مطالعہ قرآن کے پہلے اساسی اصول (یعنی قرآن کتاب ہدایت ہے) کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس نظریہ کی روشنی میں قرآن "امام" نہیں بلکہ "مأموم" ہے، قرآن "پیشوا" نہیں بلکہ "پیروکار" ہے، ڈائریکشن دینے والا نہیں بلکہ ڈاکٹر سروش کے الفاظ میں Consumer ہے۔ ہم ذیل میں اُن اہم نکات کی طرف اشارہ کریں گے جن سے اس نظریہ کا بطلان اور اس کے قرآن سے ہدایت پانے میں مانع ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے:

ا۔ قرآن بدلتا نہیں، بدل دیتا ہے

قرآن کریم کے سائنسی علوم یا بشری علوم کا محتاج ہونے کا نظریہ اس لیے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس کا لازمہ ع "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم، خود نہیں بدلتا، معاشروں، انسانوں اور مفاہیم و تصورات کو بدل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو "ہادی" اور "امام" (7) قرار دیا ہے۔ قرآن کا کام، انسانی علوم اور تصورات کو صحیح ڈگر پر لگانا اور انسانیت کی خیر اور سعادت کی طرف امامت، ہدایت اور رہنمائی ہے۔ قرآن کریم بنی نوع بشر کی رہنمائی میں کسی

بشری سرمائے کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم اپنی پیشوائی میں زبان و ادبیات کا محتاج بھی نہیں ہے اور اگر دقیق بات کی جائے تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن اپنی پیشوائی میں عربی زبان و ادبیات کا محتاج ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ قرآن کی مجبوری اور احتیاج نہیں، بلکہ قرآن کے مخاطب کی مجبوری اور احتیاج ہے۔

ہمارے خیال میں قرآن کریم اور عربی زبان و ادبیات کا معاملہ ایک ایسے دانش ور اور اُس کے مخاطب کا معاملہ ہے جو اپنی بات اور اپنا نظریہ، اپنے مخاطب تک دنیا کی ہر زندہ زبان اور دنیا میں رائج رابطے کے ہر وسیلے (communication Skill) میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن اس کے سامنے ایک ایسا مخاطب بٹھا دیا جائے جو حواس پنجگانہ میں سے فقط سماعت کی طاقت رکھتا ہو اور زبانوں میں سے فقط حجاز کی سرزمین کے چند عرب قبیلوں کی بنائی، سنواری عربی زبان جانتا ہو۔ یقینا یہاں یہ دانش ور عربی زبان میں گفتگو کے ذریعے اپنے مخاطب سے بات کرے گا۔ لیکن یہ اُس دانش ور کی مجبوری نہیں، بلکہ اُس کے مخاطب کی مجبوری اور احتیاج ہے۔ کیونکہ جب بھی اس مخاطب کے ساتھ کسی اور زبان یا کسی اور communication skill کے ذریعے بات کی جائے گی، وہ زبان حال سے یہی کہے گا کہ میری مجبوری ہے کہ مجھے دیگر زبانوں سے آشنائی حاصل نہیں اور نہ ہی میرے پاس کانوں کے علاوہ کوئی اور حس و حواس ہیں، پس مجھے حجاز کی عربی زبان میں بول کر بات سمجھائی جائے۔

لہٰذا اگر قرآن کریم نے اپنے مخاطب کے ساتھ عربی زبان میں گفتگو کی ہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن عربی زبان و ادبیات کا محتاج ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے۔ مُلک و ملکوت، عرش و فرش اور خالق و مخلوق کے درمیان رابطے میں انسان محتاج تھا کہ اُس کے ساتھ دنیا کی کسی بہترین زبان میں نزول وحی کے ذریعے اور بشری لبادے میں ملبوس ایک پیغمبر کے واسطے سے بات کی جاتی اور اللہ تعالی نے "عربی مبین" میں وحی نازل کرکے، نبی کریم ﷺ کی زبانی اپنی بات، اپنی مخلوق تک پہنچادی ہے۔

باقی رہا بنی نوع بشر کے پاس پہلے سے موجود تصور کائنات اور فکری و فلسفی فہم کے مطابق بات کرنے کا معاملہ تو یہاں بھی صورتحال وہی ہے جو زبان و ادبیات کے معاملے میں تھی۔ یہ درست ہے کہ قرآن کا ہر مخاطب، اپنے تصور کائنات اور فکری و فلسفی فہم کے مطابق قرآن کی محفل میں بیٹھتا ہے، لیکن آیا یہ کہنا درست ہوگا کہ پس قرآن اپنے مخاطب کے تصور کائنات اور فکری و فلسفی فہم کا محتاج ہے؟ ہر گز نہیں! یہاں بھی قرآن کا مخاطب اس امر کا محتاج ہے کہ اُس کے ساتھ اُن تصورات اور اُسی *World View* کی بنیاد پر بات کا آغاز کیا جائے جس سے وہ مانوس ہے۔ لیکن قرآن کا ہنر یہ ہے کہ اپنے مخاطب کے مانوس اور جانے

پہچانے تصورات اور فکر و فہم سے بات شروع کرتا ہے لیکن بات کے اختتام پر اپنے مخاطب کا تصور کائنات اور فکری و فلسفی فہم بدل دیتا ہے۔
پس قرآن خود نہیں بدلتا، بدل دیتا ہے؛ جبکہ قرآن کی احتیاج کا نظریہ رکھنے والے دانش وروں کی مجبوری یہ ہے کہ ع "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"۔ یہ قرآن کی مجبوری نہیں، قرآن کے مخاطب کی مجبوری ہے کہ وہ قرآن سے استفادہ کرنے کے لیے کم از کم اتنی انسانی معرفت اور فکری و فلسفی فہم کا وارث ہو جو فہم و شعور اور فکر و فلسفہ نزول قرآن کے وقت صحرائے حجاز کے عربوں کے پاس موجود تھا۔

۲۔ غلط مقدمات سے درست نتیجہ نہیں نکلتا

قرآن کریم کی احتیاج کا نظریہ اس لیے بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس نظریہ کی بنیاد مغالطے اور بے اساس مقدمات پر رکھی گئی ہے۔ یہ نظریہ اُس وقت ثابت ہو سکتا ہے جب تمام بشری علوم تبدیل ہو رہے ہوں اور ان کی تبدیلی انسان کے فکری اور فلسفی فہم، اُس کے تصور کائنات اور دینی فہم کو بھی دگرگون کر رہی ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ انسانی علوم کی تبدیلی، تنہا اُس صورت میں انسان کے تصور کائنات، اُس کے فلسفی فہم اور دینی فہم کو تبدیل کر سکتی ہے جب علوم میں دگرگونی کا مطلب یہ ہو کہ کسی علم کا ہر جدید انکشاف، اُس علم میں ہونے والے قدیم انکشاف کو غلط ثابت کر دے۔ لیکن آیا علوم میں پیشرفت کا مطلب یہی ہے؟ ہرگز نہیں! کسی علم میں "بسط" (پیشرفت) کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ اُس علم کی تمام سابقہ معلومات باطل قرار پائیں۔ علوم کی تاریخ میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک علم کی تمام بنیادی معلومات باطل قرار پائی ہوں۔ علوم میں پیشرفت کا درست معنی یہ ہے کہ جدید معلومات کا قدیم معلومات پر اضافہ ہوتا رہے۔
مثال کے طور پر ریاضیات، سائنسی علوم اور بشری علوم میں ماضی کی نسبت سینکڑوں تبدیلیاں آچکی ہیں لیکن آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی میں ان علوم میں جو کچھ کشف ہوا تھا، وہ سب باطل ہے؟ ہرگز نہیں! ان علوم کے بے شمار قدیم انکشافات، آج بھی مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں اور انہی انکشافات کی اساس پر جدید انکشافات رونما ہو رہے ہیں۔ لہٰذا جب ان علوم کی اکثر قدیم معلومات (خواہ تعداد میں کم سہی) مسلمہ ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر سروش کے علوم میں تحول اور پیشرفت کے نظریہ پر علامہ صادق لاریجانی کا یہ تبصرہ قابل توجہ ہے:

"آنچه که متحول می شود، بنظر ایشان آیا مجموع یك معرفت خاص یعنی یك رشتۂ معرفتی خاص است یا اینکه گزارہ های واقع در یك معرفت و نیز مفاهیم به کار رفته شدہ در اآن۔۔بطلان قضیۂ "همه معارف در تحولند" را آفتابی می سازد۔"

یعنی: "سوال یہ ہے کہ اُن (ڈاکٹر سروش) کی نظر میں جو تبدیلی آ رہی ہے آیا وہ ایک خاص معرفت یعنی ایک خاص علمی شعبے میں بطور مجموعی تبدیلی آ رہی ہے، یا یہ کہ اُس علمی شعبے کی تمام تر معلومات اور اُس میں استعمال ہونے والے تمام مفاہیم بدل رہے ہیں؟ جب ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ تمام معارف میں تبدیلی آ رہی ہے، تو آیا ہماری مراد یہ ہے کہ ریاضیات و نجوم و فلسفہ و فقہ اور ان جیسے علوم کے مسائل اور مفاہیم کا مجموعہ من حیث المجموع تبدیل ہو رہا ہے یا مراد یہ ہے کہ ان علوم میں استعمال ہونے والے تمام مسائل اور مفاہیم میں سے ہر ایک بدل رہا ہے۔

ان دونوں احتمالات میں بہت زیادہ فرق ہے: پہلے احتمال میں کسی علم کے ہر ایک مسئلہ اور نظری مفاہیم کی تبدیلی مراد نہیں ہے لہٰذا اس صورت میں یہ کہنا کہ "تمام علوم میں تبدیلی آ رہی ہے" اس بات سے منافات نہیں رکھتا کہ مختلف علوم کے بعض مسائل ثابت رہیں۔ لیکن دوسرے احتمال میں اگر ہمیں کسی علم کی تاریخ میں مختلف ادوار میں تنہا ایک پائیدار مسئلہ بھی مل جائے تو یہ اس دعوی (تمام علوم میں تبدیلی آ رہی ہے) کے بطلان کو آشکار کرنے میں کافی ہے۔" (8)

خلاصہ یہ کہ اس حاذق ناقد کی نظر میں ڈاکٹر سروش نے اپنے نظریے کی بنیاد جس مجمل دعوے پر رکھی ہے اُس کی دو ہی تفسیریں کی جا سکتی ہیں (9) یہ تفسیریں درج ذیل ہیں:

- یہ کہ تمام علوم میں تبدیلی کا مطلب یہ ہو کہ تمام علوم کے بعض مسائل پائیدار ہیں۔ لیکن بعض میں تبدیلی آ رہی ہے اور یوں علوم میں اجتماعی طور پر ایک تبدیلی آ رہی ہے۔
- یہ کہ تمام علوم کے تمام مسائل اور مفاہیم بدل رہے ہیں۔

لیکن ان دونوں تفسیروں کی اساس پر موصوف کا اصل نظریہ باطل ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اگر مراد پہلی شق ہو تو یہ بات اگرچہ درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مختلف علوم میں آنے والی جزوی تبدیلیوں سے انسان کے تصور کائنات میں تبدیلی اور نتیجہ میں اُس کے دینی فہم میں تبدیلی آ رہی ہو۔ اور اگر مراد دوسری شق ہو تو یہ شق اس لیے باطل ہے کہ مختلف علوم کے سینکڑوں مسائل ہمیشہ مسلم رہے ہیں۔ مثال

کے طور پر ریاضیات، طبیعیات، فلسفہ اور دیگر علوم کے ابتدائی مفاہیم اور مسائل ہمیشہ سے ثابت چلے آ رہے ہیں۔ اور علوم میں ایسی تبدیلی کا دعویٰ کہ تمام علوم کے تمام مسائل بدل رہے ہوں، سراسر غلط ہے۔ لہٰذا اس غلط دعوی کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی علوم میں پیشرفت کی وجہ سے انسان کا تصور کائنات بدل رہا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک مؤمن کا قرآن و سنت سے فہم (دینی فہم) تبدیل ہو رہا ہے اور قرآن کی تفسیر تنہا اس بدلتے فہم کے مطابق ہی کی جا سکتی ہے۔

۳۔ انسانی معرفت میں تبدیلی کا لازمی نتیجہ، فہم قرآن میں تبدیلی نہیں

اب تک کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے قاری کا ان متون سے دینی فہم، بشری علوم کا محتاج ہی نہیں ہے۔ نیز جس دعوی کو بنیاد بنا کر دینی فہم میں تبدیلی کا شور مچایا گیا ہے وہ دعوی یا تو سرے سے باطل ہے یا اُس کا نتیجہ وہ نہیں نکلتا جو نکالا گیا ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیا جائے قرآن اپنی تفسیر میں بشری علوم کا محتاج ہے اور بشری علوم میں تبدیلی آ رہی ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ قرآن و سنت سے ایک دیندار کا دینی فہم، انسانی علوم کے اُن مسلمہ مسائل اور معلومات کی بنیاد پر استوار ہو جن میں تبدیلی نہیں آتی۔ یقیناً اس صورت میں یہ فہم پائیدار ہو گا۔ اس کے علاوہ دینی فہم میں تبدیلی کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ قرآن و سنت کا بنیادی فہم باطل ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دیندار کی سابقہ دینی معلومات پر جدید دینی معلومات کا اضافہ ہوتا چلا جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ڈاکٹر سروش کا دعوی یہ ہے کہ: " کوئی جدید آگاہی سابقہ معلومات کو اپنی جگہ پائیدار نہیں رہنے دیتی، بلکہ اُس کے معنی و مفہوم کو تبدیل کر دیتی ہے اور ہر جدید انکشاف، ایک نیا قرینہ ہوتا ہے اس امر پر کہ ہم پرانے موضوع کی نئے سرے سے تفسیر کریں۔" (10) اگر ہم ایک لمحہ کے لیے انسانی معرفت کے باب میں اس غلط دعوی کو مان بھی لیں تو بھی اس یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی معرفت کے باب میں ہر جدید آگاہی، قرآنی آیات سے قاری کے دینی فہم کو بھی تبدیل کر دے۔

مثال کے طور پر قدیم فلکیات میں زمین کو ساکن اور تنہا سورج کو متحرک سمجھا جاتا تھا۔ جدید فلکیات میں نہ تنہا سورج متحرک، بلکہ زمین کا متحرک ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے۔ ماضی میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دن رات کا آنا جانا، تنہا سورج کی حرکت کا مرہون منت ہے جبکہ آج ہم جانتے ہیں کہ دن رات کا آنا جانا سورج اور زمین دونوں کی گردش کا محتاج ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا فلکیات کے علم میں یہ تبدیلی، قرآن کریم کی آیات سے قاری کے فہم میں تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے؟ نہیں! اس لیے کہ قدیم فلکیات کی روشنی میں

بھی قاری کا اُن قرآنی آیات سے جن میں زمین و آسمان کی تخلیق اور دن رات کے آنے جانے کو اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور تدبیر الٰہی کی نشانی قرار دیا گیا ہے فہم یہ تھا کہ فلکیات کے یہ مظاہر، اللہ تعالی کی قدرت اور تدبیر الٰہی کی نشانی ہیں اور جدید فلکیات کی روشنی میں بھی قاری کا ان آیات سے فہم یہی رہے گا۔ نیز ایسا بھی نہیں ہے کہ قرآن کریم کی تمام آیات کو فلکیات، ریاضیات اور طبیعیات یا دوسرے الفاظ میں جہان شناسی (Ontology)اور انسان شناسی (Anthropology)یسے علوم کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہو۔مثال کے طور پر قرآن کریم میں حکم ہوا ہے کہ : "بے شک اللہ تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ اس قرآنی حکم کا فلکیات کے اس انکشاف سے کیا ربط ہے کہ زمین کی گردش کی رفتار اور مدار کیا ہےاور سورج کی گردش کی رفتار اور مدار کیا ہے؟ یقینا ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔اس لیے کہ سورج زمین کے گرد گھومے یا زمین سورج کے گرد، دونوں صورتوں میں اللہ تعالی کا حکم یہی ہے کہ انسان عدل کرے۔ پس اس قرآنی آیت کا فہم کسی طور فلکیات جیسے علوم کے فہم کا مرہون منت نہیں ہے۔استاد صادق لاریجانی کے بقول:

"بڑی آسانی سے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ (مثال کے طور پر) کتاب وسنت سے ایک حکم کے اثبات اور استنباط کا سورج کے مرکز ہونے کے فرض یا زمین کے مرکز ہونے کے فرض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔ ہمارا دعوی یہ ہے کہ قرآن وسنت سے مثال کے طور پر "نماز جمعہ کے وجوب" کے حکم کا استنباط زمین یا سورج کے مرکز ہونے سے کوئی ربط نہیں ہے۔۔۔ مثال کے طور پر فرض یہ ہے کہ اس حکم کا استنباط ان قواعد کی روشنی میں ہوا ہے کہ "آیۂ شریفہ نماز جمعہ کے وجوب میں ظہور رکھتی ہے"، "ظواہر کا حجت ہونا ایک اصول ہے" اور "اس ظہور کا کوئی معارض بھی نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ یہاں "آیت کے ظہور کا وجوب میں تحقق" سورج یا زمین کے مرکز ہونے سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتا۔یعنی اس آیت میں امر کی ہیأت سے نماز جمعہ کا وجوب سمجھا جا رہا ہے خواہ ہم سورج کے مرکز ہونے کے قائل ہو جائیں یا زمین کے مرکز ہونے کے قائل ہو جائیں۔" (11)

۴۔ بشری معرفت اور دینی معرفت کا موضوع مختلف ہے

دینی معرفت کو بشری معرفت پر اس لیے بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بشری معرفت کا موضوع کچھ اور ہے اور دینی معرفت کا موضوع کچھ اور ہے۔ قرآن وسنت سے ہمیں دینی معرفت حاصل ہوتی ہے اور بشری علوم سے بشری معرفت۔ بشری معرفت جن انسانی علوم کا ارمغان ہے اُن میں سے اکثر کا موضوع

عالم طبیعت ہے۔ یہ علوم ہمیں عالم طبیعت پر حکمرانی عطا کرتے ہیں۔ طبیعی علوم مثال کے طور پر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم کیسے زمین سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کر سکے ہیں، سمندروں کے بیکراں پانیوں پر کیسے اپنا راج قائم کر سکتے ہیں اور فضاؤں، خلاؤں کو حیلوں، حربوں سے اپنے پروں تلے روند سکتے ہیں۔

لیکن قرآن و سنت ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ تسخیر کائنات کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے اُگائے ہوئے غلہ کو کیسے استعمال کرنا ہے، آیا اس غلہ پر کوئی زکات اداد کرنا ہے کہ جس سے چند فقیروں کا بھی گذر بسر ہو سکے یا اپنی بھوک مٹا لینے کے بعد اضافی غلہ دریاؤں اور سمندروں میں پھینک دینا ہے تاکہ اناج کی قیمتیں نیچے نہ آنے پائیں؟ آیا سمندروں کے بے کراں پانیوں کے دل میں اتر کر خدا کی یاد میں ڈوب جانا ہے یا ساحل سمندر کی امواج پر سوار ہو کر رنگ رلیاں منانا ہیں؟ آیا فضاؤں میں ذکر خدا کی صوتی امواج ایجاد کرنا ہیں یا نغموں اور گانوں کی شیطانی صوتی امواج نشر کرنا ہیں؟

خلاصہ یہ کہ بشری معرفت کا موضوع تسخیر کائنات ہے جبکہ دینی معرفت کا موضوع انسانی کردار کی رہنمائی ہے۔ اب اگر بشری معرفت میں کوئی تبدیلی آجائے اور عالم طبیعت پر حکمرانی کے بعض فارمولے بدل جائیں یا انسان عالم طبیعت پر پہلے سے بہتر اور دقیق تر حکمرانی کرنے لگے تو آیا اِس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دینی معرفت بھی بدل جائے گی اور انسان قرآنی آیات کے مطالعہ سے قاری جہاں زکات کی ادائیگی کے وجوب کا حکم اخذ کرتا تھا اب اضافی غلہ کو سمندروں میں پھینک دینے کے جواز کا حکم سمجھنے لگے گا؟ یقینی طور پر ایسا نہیں ہے اور علمی اصطلاح میں دینی معرفت کو بشری معرفت پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق کا مصداق ہے۔

ہاں! ان علوم کے انکشافات سے نئی ابحاث سامنے آسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سوال پیش ہو سکتا ہے کہ سمندروں کے پانیوں کے دل میں نماز کی ادائیگی کیسے ممکن ہے اور نماز کی صورت کیا ہو گی؟ لیکن یہ سوال (جس کا منشاء طبیعی علوم میں تبدیلی ہے) دینی فہم کو تبدیل نہیں کرے گا بلکہ اُس میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔ پس طبیعی علوم میں پیشرفت یا تبدیلی عین ممکن ہے دینی فہم میں اضافے کا باعث بن جائے لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ تبدیلی دینی فہم کے ابطال کا باعث بنے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ انسان کی عالم طبیعت پر حکمرانی کا دائرہ کار انتہائی محدود ہو، لیکن اُس کا قرآن و سنت سے فہم بہت دقیق ہو۔ جیسا کہ صدر اسلام کے کئی دینداروں کے بارے میں یہ دعوی درست ہو گا۔ کیونکہ وہ عالم طبیعت کے مقہور ہو کر بھی ایسے انسانی کردار کے حامل تھے جس کا قرآن و سنت تقاضا کرتے ہیں اور آج کا انسان عالم طبیعت پر قہر

و غلبہ پانے کے بعد بھی غیر انسانی کردار کا مالک ہے۔ پس بشری معرفت اور دینی معرفت کے پھیلاؤ، سکڑاؤ میں کوئی نہ ٹوٹنے والا رابطہ نہیں ہے اور ان دونوں کے درمیان ایسا رابطہ جوڑنا کہ سائنسی اور طبیعی علوم میں ہر تبدیلی، قرآن و سنت کے فہم میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہو، سراسر غلط ہے۔

۵۔ دینی معرفت یقین آور ہے

اگر ہم یہ نظریہ اپنا لیں کہ قرآن کریم اپنے مطالب پہنچانے میں بشری معرفت کا محتاج ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن و سنت سے ہمارے کسی فہم کا بھی اعتبار باقی نہ رہے۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ اس نظریہ کے قائلین کے مطابق بشری معرفت میں مسلسل تبدیلی آ رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بشری معرفت میں مسلسل تبدیلی آ رہی ہے تو آیا یہ اِس معرفت کا کوئی اعتبار ہے۔ نہیں! پس جس معرفت کا اپنا اعتبار نہیں ہے، اُس کی بنیاد پر استوار دینی فہم کا کیا عتبار ہوگا؟ پس ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی احتیاج کا نظریہ تنہا ہمارے اسلاف کے قرآن و سنت سے فہم کو معتبر نہیں سمجھتا بلکہ متأخرین کے فہم کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں ہمارے اسلاف نے قدیم بشری معرفت کی روشنی میں قرآن و سنت کا مطالعہ کیا تھا جو جدید سائنسز اور معاصر بشری معرفت کی روشنی میں باطل ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جس بشری معرفت کی روشنی میں قرآن و سنت کا فہم حاصل کر رہے ہیں، کل اِس بشری معرفت میں تبدیلی آ جانے کے سبب ہمارا دینی فہم بھی باطل ہو جائے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اِس نظریہ کی روشنی میں قرآنی آیات سے ہمارا کوئی فہم بھی حتمی اور پائیدار نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر سروش کا دعوی یہ ہے کہ:

"مدعای بزرگ ما نیز همین است که سر عوض شدن معرفت دینی ـ ـ ـ آگاهیهای پیشین را به حال خود نمی گذارد۔"

یعنی: "ہمارا بڑا دعوی بھی یہی ہے کہ دینی معرفت کی تبدیلی کا راز (وہ تبدیلی جو ایک حقیقت ہے اور تفسیر طلب ہے) اِس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ایک جدید آگاہی، خواہ تصدیق کرنے والی یا ابطال کرنے والی یا بے طرف کسی اور جگہ حاصل ہوتی ہے جو سابقہ معلومات کو اپنے حال پر باقی نہیں چھوڑتی۔" (12)

اس دعوی کی روشنی میں اگر یہ نظریہ مان لیا جائے کہ انسانی علوم اور انسان کے تصور کائنات میں آنے والی ہر تبدیلی، اُس کے سابقہ دینی فہم سے مطابقت رکھتی ہو تو اُس کی تائید کرتی ہے اور مخالفت کی صورت میں اُسے باطل قرار دیتی ہے، تو یقینا اگر ایک عصر میں بشری علوم نے یہ ثابت کیا کہ انسان بندر کی اولاد ہے تو قرآن میں "انسان" کے لفظ سے اس مفہوم سے مطابقت نہ رکھتا ہوا ہر مفہوم اخذ کرنا باطل قرار پائے گا۔

اور اگر کسی عصر میں انسانی معرفت میں انسان کے بنیادی تصور میں کوئی اور تبدیلی آ گئی تو پھر انسان کے لفظ سے بندر کی اولاد کا مفہوم اخذ کرنا غلط ٹھہرے گا اور اسی طرح یہ سلسلہ کہیں رکنے نہ پائے گا اور نتیجہ میں کوئی فہم بھی قابل اعتبار نہ رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی احتیاج کے نظریہ کے مطابق کیونکہ ہر بشری معرفت بدلنے والی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بشری معرفت کی بنیاد پر استوار قرآن و سنت سے ماخوذ کسی فہم کا اعتبار باقی نہیں رہے گا۔ اِس سے پتہ چلا کہ قرآن و سنت کے فہم کے باب میں یہ روشنفکرانہ نظریے کا لازمہ قرآن و سنت سے ہر فہم کو باطل اور اُس پر عمل کو بے سود قرار دینا ہے۔ ممکن ہے اس نظریہ کے قائلین خود اِس لازمہ سے غافل ہوں لیکن بہر صورت ان کے نظریات کا حتمی نتیجہ یہی نکلے گا۔ لیکن یہ نتیجہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن و سنت سے کسب شدہ دینی معرفت کا ارمغان، یقین آوری ہے۔ قرآن کا مطالعہ انسان کو یقین کی منزل پر لے جاتا ہے اور اُسے فکر و نظر اور علم و عمل کی ٹھوس بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

بلکہ ہمارا دعوی یہ ہے کہ معرفت (خواہ غیر دینی بھی کیوں نہ ہو) کا کمال، یقین آوری ہے۔ ہم اس سے قبل مجلّہ نور معرفت کے صفحات پر معرفت شناسی کے حوالے سے سلسلہ وار مقالات میں سوفسطائیت کو رد کر چکے ہیں اور معرفت کی یقینی آوری پر ایک مستقل مقالہ تحریر کر چکے ہیں۔ (13) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دینی معرفت بھی انسان کو یقین کی آخری منزل تک پہنچاتی ہے۔ بلکہ قطعی دلائل کی روشنی میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے دینی رہبر و رہنما (چودہ معصومین علیہم السلام)، دینی معرفت میں عصمت کی منزل پر فائز تھے۔ یعنی جہاں اُن کے عمل میں خطا کا امکان نہ تھا، وہاں اُن کے علم و معرفت میں بھی خطا کا کوئی امکان نہ تھا۔ باقی رہا عالم انسانوں کا معاملہ تو وہ بھی نسبی طور پر علم میں عصمت کی بعض منزلوں پر پہنچ سکتے ہیں اور ایسے علم کے وارث بن سکتے ہیں جس میں خطا کا کوئی امکان نہ ہو۔ البتہ "دینی معرفت کی یقین آوری" پر ایک الگ مقالہ درکار ہے اور اگر توفیقِ الٰہی شامل حال رہی تو ہم اِس موضوع پر قلم اٹھائیں گے۔

۶۔ سر سید احمد خان، میٹیریالزم کی دہلیز پر

یہاں ضروری ہے کہ سر سید احمد خان کی بعض قرآنی آیات کے بارے میں سائنسی تأویلات کے حوالے سے بھی چند ملاحظات بیان کر دیے جائیں۔ ہمارے خیال میں سر سید احمد خان کے تفسیری نظریات کسی محکم دینی، فکری، فلسفی بنیاد پر استوار نہیں ہیں۔ اگر اُن کے نظریات کو کوئی بنیاد فراہم کی بھی جائے تو وہ

ڈاکٹر سروش کی فراہم کردہ بنیاد سے بہتر نہ ہو گی۔ اور جب ڈاکٹر سروش کی کھڑی کی گئی بنیاد، خود اپنی جگہ بے بنیاد ہے تو سر سید احمد خان کے نظریات کا بے اساس ہونا بھی واضح ہے۔

بہرصورت، سر سید احمد خان نے جس انداز سے نیچرل سائنسز کے انکشافات کی روشنی میں قرآنی آیات کی تأویل کی ہے، اِس نے انہیں میٹیریالزم کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے۔ یوں بھی اُن کے فکری نظام میں ایک درونی تضاد نظر آتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو اللہ تعالی پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالی کے جسم و جسمانیات سے پاک اور منزہ ہونے کا قائل ہے، اُس کے لیے ملائیکہ کے مافوق الطبیعت وجود کو تسلیم کرنے میں بھلا کونسی مشکل پائی جاتی تھی؟ شاید یہی کہ اُن کی نظر میں عالم ہستی کے تمام حقائق کو طبیعی حقائق (Physical Facts) ہونا چاہیے۔ لیکن اگر یہ زعم درست ہو تو پھر نعوذ باللہ، اللہ تعالی کو بھی ایک طبیعی حقیقت ہونا چاہیے۔ اور اگر تمام حقائق کا طبیعی ہونا ضروری نہیں تو کیا حرج ہے کہ اس کائنات کے بعض حقائق، منجملہ ملائیکہ، جبرائیل، اور ابلیس وغیرہ مابعد الطبیعی حقائق (Metaphysical Facts) ہوں؟

اس کے علاوہ، اگر تفسیر میں سر سید احمد خان کی روش اپنالی جائے تو تأویلات کا ایک بند نہ ہونے والا دروازہ کھل جائے گا اور یہ عین ممکن ہے کہ سینکڑوں قرآنی آیات کے ظواہر سے دستبردار ہونا پڑے۔ حالانکہ قرآنی آیات کے ظواہر سے اُس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک اُن کے ظاہری معنی و مفہوم کی حجیت کے خلاف کوئی صریح نقلی یا عقلی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ سر سید احمد خان نے اپنی تأویلات میں بلا دلیل قرآنی آیات کے ظواہر سے ہاتھ اٹھایا ہے۔

اگر سر سید احمد خان کے لیے ملائیکہ، جبرائیل اور شیطان کے وجود پر دلالت کرنے والی کئی آیات کے ظواہر سے ہاتھ اٹھانا اور اِن موجودات کے مستقل وجود کا انکار ضروری تھا تو اُن کی روش پر چلتے ہوئے انسانی روح کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے اور روح کی تاویل، بدنی قوتوں کے ذریعے کی جا سکتی ہے اور یوں انکار کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا بڑھتا، برزخ، محشر اور آخرت کے کئی مقامات اور حالات کے انکار تک بھی پھیل سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کی ضرورت اور دلیل کیا ہے؟ ہمارے خیال میں اِس کی تنہا دلیل، سر سید احمد خان کا یورپ کے میٹیریالسٹوں کے نظریات سے متاثر ہونا ہے۔

سر سید احمد خان نے قرآنی آیات کی تفسیر میں جو روش اپنائی، اُس میں اُن کا یورپ کے جدید علمی رونسانس کے زلزلۂ افکار سے متاثر ہونا واضح نظر آتا ہے۔ یورپ کے علمی اور سائنسی انقلاب کے نتیجے میں عیسائیت

کی کھوکھلی الہیات کے خلاف جو یلغار یورپ میں شروع ہوئی، گویا سر سید احمد خان بعض عیسائی الٰہی حکماء کے طرز پر اُس یلغار کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ انہیں اسلام کے پیش کردہ دینی مفاہیم کا یہ دفاع کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ عالم اسلام میں دینی افکار کو جو مضبوط فلسفی اور فکری بنیادیں فراہم ہیں، اُن کے ہوتے ہوئے قرآنی آیات اور دینی معرفت کی سائنسی تأویلات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر سر سید احمد خان آخوند ملا صدرا اور علامہ طباطبائی کی تصنیفات سے آشنا ہوتے تو انہیں قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی روش اپنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

قرآن کریم کی بے نیازی

سابقہ ابحاث کی روشنی میں مطالعہ قرآن کے باب میں قرآن خوانی اور قرآن فہمی کا ایک اساسی اصول یہ سامنے آتا ہے کہ قرآن، بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے مختلف بشری علوم کے ماہرین کے علمی نظریات اور اِن علوم کی کشفیات کا محتاج نہیں ہے۔ قرآن کریم میں بنی نوع بشر کی تعلیمات کا سہارا لیے بغیر اپنے بات قاری تک پہنچانے کی مکمل صلاحیت اور سعادت اور کمال کی طرف رہنمائی کا مکمل ہنر پایا جاتا ہے؛ لہٰذا قرآن اپنے مطالب کی تعلیم اور تفہیم میں عام انسانوں کی ترجمانی اور بیگانوں کے قلم سے بے نیاز ہے۔ پس بشری علوم کے مسائل اور انکشافات کی معلومات کا حافظ بن کر قرآن فہمی کی کوشش کرنا اور قرآنی ارشاد و ہدایت کی سلسبیل کو انسانی علوم کے پیمانوں میں ڈال کر دیکھنا اور اُس کے رنگ معین کرنا، سراسر غلط ہے۔ مطالعہ قرآن کے اس اساسی اصول کے حوالے سے استاد جوادی آملی حفظہ اللہ کا لکھنا ہے کہ:

"اللہ تعالی نے تمام اسلامی اصول کی بابت قرآن کی جامعیت کو "تبیان" قرار دیا ہے۔ پس اس کتاب میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی کہ باہر سے اُس کمی کا جبران کیا جائے؛ قرآن میں نہ قانون اور انسانی اصولوں کی کمی ہے، نہ شناخت اور اسلامی معارف کی کمی ہے اور نہ ہی ان مطالب کے بیان کی کمی ہے۔ یعنی قرآن اپنے مضامین و مطالب کے لحاظ سے بھی بیگانوں کے مطالب سے بے نیاز ہے اور ان مطالب کی تعلیم اور تفہیم میں بھی ایسا رسا بیان رکھتا ہے کہ دوسروں کی ترجمانی اور بیگانوں کے قلم سے بے نیاز ہے؛ کیونکہ ہر شئے کے لیے "تبیان" ہونے کا معنی یہی ہے۔" (14)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یقیناً مطالعۂ قرآن کا یہ اصول، ایک اسی اصول ہے۔ لیکن یہاں ممکن ہے بعض لوگ اِس اصول سے یہ غلط نتیجہ اخذ کر لیں کہ جب قرآن بشری علوم و معارف کا محتاج نہیں ہے تو پس قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے نہ عربی زبان و ادبیات سے آشنائی کی ضرورت ہے، نہ علومِ قرآن سے آشنائی ضروری ہے اور نہ ہی قرآن کریم کے دریائے فیض سے فیضیاب ہونے کے لیے کسی فکری، فلسفی اور بشری معرفت کا ظرف ضروری ہے۔

یقیناً یہ نتیجہ اخذ کرنا، سراسر غلط ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کا بشری علوم کا محتاج نہ ہونا ایک امر ہے اور قرآن کریم سے استفادہ کے لیے قاری کا بعض علوم اور مطالعہ کی مہارتوں سے آشنائی کا محتاج ہونا ایک الگ امر ہے۔ اِس فرق کی روشن دلیل یہ ہے کہ جب قرآن کا مخاطب پیغمبر اکرم ﷺ جیسی معصوم ہستی ہو تو وہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے میں اُن تمام بشری معرفتوں سے بے نیاز ہوتی ہے جن کا ایک عام انسان محتاج ہے۔ اگر پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کو قرآن سمجھنے کے لیے علوم قرآن اور اصول و مبانی تفسیر سے آشنائی کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اُن کے لیے ریاضیات، طبیعیات اور نجوم وغیرہ کے ماہرین کے اقوال جاننا ضروری تھا تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض بشری علوم اور تحصیل علم کی مہارتوں کا محتاج ہونا یا نہ ہونا، انسان کی احتیاج یا عدم احتیاج ہے، نہ قرآن کی احتیاج۔

ہاں! جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے تو وہ قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے عربی زبان و ادبیات، علوم قرآنی، اصول تفسیر اور معصومین علیہم السلام کی احادیث سے آشنائی کا محتاج ہیں اور اگر اِس معنی میں کوئی قرآن کی احتیاج کا نظریہ پیش کرتا ہے تو یہ درست ہے۔ کیونکہ واضح ہے کہ قرآن کریم کا قاری جس قدر ریاضیات، طبیعیات، نجوم، عمرانیات، تاریخ، خلاصہ یہ کہ بشری علوم اور مہارتوں سے بہتر آشنا ہوگا، اُسی قدر قرآن کریم سے بہتر رہنمائی حاصل کر پائے گا۔ بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ اِن علوم سے آشنائی کے سبب، متأخرین کا قرآنی آیات سے فہم، اسلاف کے فہم سے برتر اور بہتر ہو۔ استاد آیۃ اللہ جوادی آملی قرآن کریم کے اپنے مطالب کی تعلیم و تفہیم میں دوسروں کے علوم سے بے نیاز ہونے کے اساسی اصول کی توضیح میں رقمطراز ہیں کہ:

"اِس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ انسان، قرآن کے ساتھ جاہلانہ انداز سے پیش آئے اور اُس نے جو علوم اور معارف سیکھے ہیں، انہیں نظر انداز کر دے اور ایک ان پڑھ، جاہل مطلق کی حیثیت سے اِس عظیم الٰہی

کتاب کے حضور حاضر ہو؛ کیونکہ (قرآن پر دیگر علوم کے) مطالب ٹھونسنے اور (قرآن سے دیگر علوم کی روشنی میں) مطالب حاصل کرنے میں فرق ہے۔ حق بات یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانی معلومات کو وحی الہی پر ٹھونسے اور قرآن کو اپنی ہوا و ہوس کے تابع بنائے اور قرآن کی تفسیر اپنی مخصوص رائے کے مطابق کرے؛ لیکن علوم کو حاصل کرنا، دل کی ظرفیت کو بڑھا دیتا ہے اور اُسے قرآنی معارف پر توجہ دینے کے قابل بناتا ہے اور شرح صدر کا سبب بنتا ہے؛ "ان ھذہ القلوب اوعیة فخیرھا اوعاھا" (15) (یہ دل ظرف ہیں، پس ان میں سے سب سے بہتر ظرف وہ ہے جو سب سے زیادہ بھرا ہوا ہو۔ (16)

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی عقل و شعور کو چھٹی دے کر قرآن کے سامنے ایک جاہل مطلق کی حیثیت سے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ یہاں افراط و تفریط، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ دوسروں کے قلم وبیان کو قرآن پر نہیں ٹھونسا جا سکتا، لیکن انسان کی فکری میراث، اُس کے قرآن کریم سے مفاہیم کو اخذ کرنے کی ظرفیت کو بڑھا دیتی ہے۔ اور جب ایسا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسلاف کا فہم، اخلاف کے فہم پر برتری رکھتا ہو۔ لہٰذا ہمارے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بعض مفسرین کا یہ تفسیری اصول کہ اسلاف کا فہم، اخلاف کے فہم کی تکیہ گاہ ہونا چاہیے، (17) اِس عمومیت اور کلیت کے ساتھ قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمان القرآن میں بیان شدہ نہ اُن کا یہ تفسیری اصول قابل قبول ہے اور نہ بعض لوگوں کی طرف سے ان کا یہ نقل کردہ اصول اپنے اطلاق اور کلیت کے ساتھ قابل قبول ہے کہ اسلاف تقوی میں اخلاف سے آگے تھے۔ ہمارے خیال میں نہ یہ ضروری ہے کہ اسلاف دینی معرفت اور علم و عرفان میں اخلاف سے آگے ہوں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ تقوی اور ایمان میں اخلاف سے ہمیشہ آگے ہوں؛ بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ اخلاف، اسلاف سے علم و معرفت میں بھی آگے ہوں اور ایمان اور تقوی میں بھی آگے ہوں۔ اگر اخلاف سے کوئی علم و معرفت اور ایمان و تقوی میں لازمی طور پر آگے ہو سکتا ہے تو وہ فقط معصوم ہستیاں۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دینی معرفت میں اِن معنوں میں تحول اور تبدیلی کا دعوی قابل قبول ہے کہ ایک انسان کا قلب و عقل، اُس کے کسب کردہ علوم و معارف، اس کے فکری اور فلسفی فہم اور اُس کی مطالعاتی مہارتوں کی روشنی میں قرآن کریم کی آیات سے پہلے سے عمیق تر، دقیق تر اور بہتر استفادہ کرنے کے اہل ہو جائیں۔ لیکن تبدیلی کے اس مفہوم میں اور اِس دعوی میں کہ بشری علوم کا ہر جدید

انکشاف، قرآنی آیات سے فہم میں تبدیلی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، زمین تا آسمان فرق ہے۔ پہلے معنی میں قرآنی آیات سے فہم میں تبدیلی قابل قبول ہے، لیکن دوسرے معنی اور دعوی میں قرآنی آیات سے فہم میں تبدیلی قابل قبول نہیں ہے۔

حوالہ جات

1 ۔ڈاکٹر عبد الکریم سروش، قبض و بسط تئوریک شریعت، موسسۂ فرہنگی صراط، چاپ دوم، ص ۸۵ ۔ تہران۔

2 ۔ ایضا، ص ۱۰۸۔ بنقل از صادق لاریجانی، معرفت دینی، مرکز ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳۷۰ ش۔ھ، ص ۳۹۔ تہران۔

3 ۔ ایضا، صص ۲۹۸، ۲۹۹۔ بنقل از ص ۳۹، ۴۰۔

4 ۔ قبض_و_بسط_تئوریک_شریعت/http://fa.wikipedia.org/wiki

5 ۔ سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، چاپ اول، لاہور، دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۹۵، صص ۲۹ تا ۳۳۔

6 ۔ ایضا، ص ۵۶۔ (یہ سر سید احمد خان کی عبارات کا مضمون ہے، عین عبارات نہیں ہیں)

7 ۔ البقرہ/ ۲؛ یسین/ ۱۲۔

8 ۔ صادق لاریجانی، معرفت دینی، ص ۱۶۔

9 ۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر سروش کی تصنیف میں اس دعوی کی دونوں تفسیروں کے حق میں بیانات پائے جاتے ہیں اور یہ امر از خود اُن کے بیانات میں تضاد کا بیانگر ہے۔ ہم یہاں اس موضوع پر اختصار کے سبب مزید روشنی نہیں ڈال سکتے۔ (دیکھیے: (۱) قبض و بسط تئوریک شریعت؛ از ڈاکٹر سروش (۲) معرفت دینی؛ از صادق لاریجانی)

10 ۔ ڈاکٹر عبد الکریم سروش، قبض و بسط تئوریک شریعت، ص ۸۴؛ بہ نقل از معرفت دینی ص ۱۷

11 ۔ صادق لاریجانی، معرفت دینی، ۶۵۔ تہران، ۱۳۷۰ھ۔ش

12 ۔ ڈاکٹر عبد الکریم سروش، قبض و بسط تئوریک شریعت، ص ۳۱۳؛ بہ نقل از معرفت دینی ص ۱۹

13 ۔ دیکھیے: نور معرفت، جلد ۲، شمارہ ۱ (جنوری تا مارچ ۲۰۱۱)

14 ۔ آملی، جوادی، سرچشمۂ اندیشہ، مرکز نشر اسراء، ج ۱، ص ۱۵۔

15 ۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷۔

16 ۔ آملی، جوادی، سرچشمۂ اندیشہ، ج ۱، ص ۲۹۔

17 ۔ ابو الکلام احمد آزاد، تفسیر ترجمان القرآن، آکادمی اسلامی، لاہور، ۱۹۷۶، ج ۱، ص ۱۲۔